بصادق ندیم

اسلامی قضا

اسلام میں دیگر امورِ شرع کی طرح قضا کا آغاز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ شارع علیہ السلام ہی اسلام کے پہلے قاضی تھے[1] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے بعض علاقوں میں اپنے والی بھیجے جو بیک وقت حاکم بھی ہوتے تھے اور قاضی بھی، مثلاً حضورؐ نے معاذ بن جبل کو یمن اور عتاب بن اسید کو مکہ کی طرف بھیجا[2] اور ان اصحاب نے حضورؐ کی زندگی میں قاضی کے فرائض انجام دیے۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے آقا کی اتباع میں سو مدینے میں فرائضِ قضا انجام دیتے تھے اور ان کے والی دیگر بلادِ اسلامی میں عامل ہونے کے علاوہ قاضی بھی ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور تک یہی صورتِ حال رہی۔ چوں کہ خلیفہ ثانی کے عہد میں فتوحات کا دائرہ پھیل گیا اور سلطنتِ اسلامی وسعت اختیار کر گئی، اب خلیفہ یا ان کے نائب کے لیے دشوار ہو گیا کہ حکومت کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ قضا کے بوجھ کو بھی اٹھائیں۔ چنانچہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قاضی اور حاکم کے مناصب کو جدا جدا کر دیا۔ انھوں نے مدینہ میں اپنے ساتھ ابوالدرداء کو قاضی مقرر کیا اور شریح کو بصرہ اور ابوموسیٰ الاشعری کو کوفے کا قاضی مقرر کیا۔ انھوں نے مؤخر الذکر کو جو خط لکھا وہ بہت مشہور ہے اور اس پر احکامِ قضا کا انحصار ہے جو اس میں مکمل طور پر آ گئے ہیں۔ اسلامی فقہ کے مؤلفین کی اکثریت نے اس خط کو اپنی تصنیفات کی اساس بنایا ہے۔ ابن حزم اندلسی (المتوفی ۴۵۶ھ) نے اس خط کو جعلی قرار دیا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہیں بلکہ حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے والی تھے اور اس وقت کوفے کے قاضی شریح تھے۔ اس خط کی روایت میں قدرے اختلاف بھی ہے۔ ہم

---

[1] محمود بن محمد بن عرفوس: تاریخ القضاء فی الاسلام (قاہرہ، ۱۹۳۴ء) ص ۱۱

[2] کاسانی: بدائع الصنائع۔ مطبعۃ الجمالیہ مصر ۱۹۱۰ء ص ۲

اسے ابن قیم الجوزیہ کی کتاب اعلام الموقعین سے نقل کرتے ہیں:

"امابعد، قضا فرض محکم اور سنت متبعہ ہے۔ جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو سمجھ بوجھ سے کام لو کیوں کہ جس حق کا نفاذ نہ ہو سکے اسے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی مجلس، توجہ اور قضا میں مساوات کو ملحوظ نظر رکھو تاکہ صاحب منزلت کو تمہارے ظلم سے فائدہ اٹھانے کی رغبت نہ ہو اور نہ کسی ضعیف کو تمہارے انصاف سے مایوسی ہو۔ شہادت شرعی کا پیش کرنا مدعی کی ذمے داری ہے اور مدعا علیہ کے لیے قسم ہے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے مگر ایسی صلح نہ ہو کہ حرام کو حلال کر دے اور حلال کو حرام بنا دے۔ اگر مدعی کہے کہ مدعا علیہ اور شہادت غیر حاضر ہے تو اس کے لیے مدت متعین کر دے اگر مدعی شہادت پیش کر دے تو اس کا حق اسے دے دو۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کے خلاف فیصلہ دے دو۔ یہ بہترین عذر ہے اور غلطی سے بچنے کی مناسب ترین صورت ہے۔ تیرا آج کا فیصلہ آئندہ کے لیے بہتر اور ہدایت یافتہ فیصلے کو مانع نہ آئے جب کہ تو حق کی طرف مراجعت کر رہا ہو، حق ہی قدیم ہے حق کو کوئی چیز باطل نہیں کر سکتی، حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں پڑے رہنے سے بہتر ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف شہادت دے سکتے ہیں، بجز اس کے جسے جھوٹی شہادت کی سزا مل چکی ہو یا کوڑوں کی سزا یافتہ ہو یا جس پر دوستی یا قرابت داری کی تہمت ہو۔ بے شک اللہ نے باطن کو بندوں سے مخفی رکھا ہے اور حدود کھلی ہوئی شہادتوں پر ہی قائم کی جائیں گی یا پھر بذریعہ قسم کے۔ اگر کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے لیے قرآن یا سنت سے معاملہ معلوم نہ ہو سکے تو فہم سے کام لو اور امور میں قیاس کرو اور امثال تلاش کرو۔ اس بات کا قصد کرو جو اللہ کو محبوب ترین ہے اور حق کے قریب ترین ہے۔ خبردار! غضب، قلق، ملال، اذیت، جھگڑے یا جھگڑے والوں کی ناپسندیدگی سے بچو (یہاں ابو عبید کو شک ہے کہ لفظ خصومۃ ہے یا خصوم) کیوں کہ قضا ایسا حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر دیتا ہے اور لوگوں میں بھی اس کا ذکر خیر ہوتا ہے جس کی حق کے معاملے میں نیت درست ہو، اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے معاملے میں اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور جو جھوٹی زینت ظاہر کرتا ہے اللہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف مخلص بندہ کو ہی قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ثواب و رزق عطا کرتا ہے اور اس کی رحمت کے خزانوں کی انتہا نہیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔"

یہ خط نقل کر کے ابن القیم سند کے متعلق لکھتے ہیں۔" ابو عبید کہتے ہیں: میں نے کثیر سے پوچھا:

کیا جعفر نے اس کی سند دی ہے ؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ تاہم ابن القیم کہتے ہیں کہ یہ خط مکتوبِ جلیل ہے اور علما نے اسے شرفِ قبولیت بخشا ہے اور اس پر شہادت اور فیصلے کے اصولوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔ حاکم اور مفتی اس پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے بعد وہ اس خط کی شرح لکھنی شروع کرتے ہیں جو اعلام الموقعین کی پہلی اور دوسری جلد پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ خط کے مندرجات کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دراصل احکامِ قاضی کا مرجع و اساس کتاب و سنت، و قیاس اور امثال و نظائر ہیں اور دلیل کے طور پر حدیث معاذ کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ جلد اوّل کے صفحہ ۲۰۲ پر فرماتے ہیں[۳] "خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو نص قرآن و حدیث نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد کی اجازت دی ہے۔ جب آپ نے معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا : اگر تمہیں عدالتی فیصلہ کرنا پڑے تو کیا کرو گے ؟ معاذ نے عرض کیا : میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر پوچھا : اگر وہ فیصلہ کتاب اللہ میں نہ ہوا تو کیا کرو گے ؟ عرض کی : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کروں گا۔ پھر فرمایا : اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی فیصلہ نہ ملا تو کیا کرو گے ؟ معاذؓ نے عرض کیا : اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کے طریق کار پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا :

خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں مندرجہ بالا حدیثِ نبوی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہی عمل ہوتا رہا۔ ہر شہر میں علما کی ایسی جماعت موجود ہوتی تھی جو احکامِ شریعت اور تفقہ فی الدین کے اعتبار سے معروف تھی۔ قاضی کو جب کوئی دقت پیش آتی تو اس جماعت کی امداد حاصل کرتا تھا۔ بہت سے قاضی مشکلاتِ قضا خلیفۂ وقت کے پاس بھیجتے تھے۔ مصر کے قاضی عیاض بن عبید اللہ ازدی نے اپنے دور کے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے شفعہ کے مسئلے میں خط لکھ کر استفسار کیا۔ بعض قاضی انتہائی ذہین تھے۔ قاضی شریح، شعبی اور ایاس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کی ذکا کو بطور مثال مشہور شاعر ابوتمام نے مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے :

---

[۳] ابن القیم الجوزیہ : اعلام الموقعین، مطبعہ سعادۃ مصر ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۲

اقدام عمرو فی سماحۃ حاتم فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

علامہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد ابن القیم الجوزیہ نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ میں قضاۃ کی فراست کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے :

خلفائے راشدین اور بنوامیہ کے دور میں قاضی اجتہاد سے کام لیتے تھے اور اپنے احکام میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ بلکہ لوگ تقلید سے مائل ناآشنا تھے، کیوں کہ ابھی مذاہب اربعہ وغیرہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ دین و دنیا کے امور میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، خلفا اور فقہا صحابہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ دولت عباسیہ کے اوائل میں بھی یہی کیفیت رہی، مگر جب خلیفہ منصور نے بغداد کو عروس بلاد اسلامیہ بنایا تو وہاں دنیائے اسلام کے علما، فقہا، صناع، تجار بھی جمع ہو گئے اور بہت سے علوم کا نشو ونما ہوا اور بہت سے اہل فارس، اہل روم اور اہل مصر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ فارسی، یونانی اور لاطینی زبان کی بہت سی کتابیں عربی میں نقل کی گئیں اور دوسری اقوام کے علوم اور عقائد کی نشر و اشاعت ہوئی۔ جدل اور مناظرے کا دروازہ کھل گیا۔ عقل کا بازار گرم ہو گیا اور فکر کی جولانیاں تیز ہو گئیں۔ احکام شرعیہ میں خلل کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لہٰذا تدوین شریعت اور قواعد تفریع من اصول الشریعۃ کی ضرورت پیش آئی چنانچہ ابوجعفر المنصور نے حضرت مالک بن انس کو اس سلسلے میں ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کے لیے کہا جو حضرت ابن عباس کی رخصت (ڈھیل) اور حضرت ابن عمرؓ کی سخت گیری سے اجتناب کرے، لہٰذا امام مالک بن انس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب المؤطا تصنیف فرمائی۔ اسی عہد میں عظیم فقہا کا ظہور ہوا اور امام ابوحنیفہ کے علاوہ باقی تین امام بھی عہد عباسیہ ہی میں ہوئے اور اہل سنت میں مذاہب اربعہ کی ترویج ہوئی۔ اسی عصر میں قاضی القضاۃ (قاضیوں کے رئیس اعلیٰ) کا منصب معرض وجود میں آیا۔ ابویوسف یعقوب بن ابراہیم (المتوفی ۱۸۲ھ) پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، انھوں نے فقہ کی تدوین کی اور اہم کتابیں لکھیں مگر ان میں سے بہت کم ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے کتاب الخراج سب سے زیادہ مشہور ہے جو انھوں نے خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھی تھی۔

اگرچہ فقہ کی تدوین سے قاضیوں کے پاس قوانین کا ڈھانچہ تیار ہو گیا اور مقدمات کا فیصلہ کرنے میں سہولت ہو گئی مگر فقہی اختلافات بڑھ گئے اور مختلف مذاہب فقہ باہم برسرپیکار رہنے لگے

ت بڑھ گئے۔ جج کا منصب تو یہ ہے کہ تعصبات سے بالاتر ہو، مگر محکمۂ قضا کسی نہ کسی مذہبِ فقہ کے
ے بغیر نہ رہ سکا۔ ہر حکمران کا ذہن اس صورتِ حال میں مختلف تھا، مگر سب سے عمدہ کام بلاد
کے امیر یوسف بن عبدالمومن (المتوفی ۵۹۱ھ) نے کیا۔ جب اس نے فقہا کے درمیان اختلافِ کثیر
یہ حکم دیا کہ قاضی فقہ کی فروعات کو چھوڑ دیں اور صرف قرآن شریف اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
بق مقدمات کا فیصلہ کریں، کسی کی تقلید نہ کریں، خود اجتہاد کریں اور قیاس اور اجماع پر انحصار کریں۔

علمائے اسلام نے منصبِ قضا پر فائز ہونے والے شخص کے لیے چند شرائط کا ذکر کیا ہے۔

پہلی شرط اسلام ہے اور قبولِ شہادت کی بھی شرط ہے، اس کی تائید میں یہ آیتِ کریمہ پیش کی جاتی ہے:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ للكافرين على المومنين سبيلا۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں پر کوئی اختیار نہیں دیا۔

لہٰذا کافر کا فیصلہ نہ مسلمانوں پر نافذ ہو سکتا ہے اور نہ کفار پر، مگر چونکہ اس آیت میں صرف کافر
ان پر اختیار کی ممانعت ہے، اس لیے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کافر کفار کا قاضی ہو سکتا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ قاضی کے لیے بالغ اور عاقل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ نابالغ کے ذمے
اہم کام نہیں لگایا جا سکتا اور عقل کے بغیر مقدمات کی گتھیاں کیسے سلجھ سکتی ہیں۔ چنانچہ امام ماوردی
اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حتی یکون صحیح التمییز، جید الفطنة، بعیداً عن السهو والغفلة متوصلا
به الی ایضاح ما اشکل وفصل ما اعضل

حق و باطل میں تمیز کرنے والا، نہایت ذہین اور غفلت اور سہو سے دور رہنے والا ہو تاکہ اپنی ذہانت سے
کی وضاحت کر سکے اور مشکلات کا حل ڈھونڈ لے۔

تیسری شرط ذکورۃ یعنی قاضی کا مرد ہونا ہے۔ اکثر علمائے عورت کے لیے عدمِ جوازِ قضا کا فتویٰ
۔ مگر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جن امور میں عورت کی شہادت درست ہے، ان میں قضا بھی
ہے۔ کاسانی اس رائے کی شرح کرتے ہوئے بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں:

واما الذکورة فلیست من جواز التقلید فی الجملة، الا انها لا تقضی
دود والقصاص، لانه لا شهادة لها فی ذلک، واهلية القضاء تدور

مع اہلیۃ الشہادۃ [۵۴]

جہاں تک قاضی کے لیے مرد ہونے کا تعلق ہے تو یہ کلی طور پر قضا کے جواز کی شرط نہیں ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ عورت حدود اور قصاص کے معاملات میں قاضی نہیں بن سکتی کیوں کہ ان معاملات میں اس کی شہادت قبول نہیں۔ اور اہلیتِ قضا کا شہادت کی اہلیت پر انحصار ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے امام ابو حنیفہ کی اس نصف اہلیت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں اور فرمایا ہے کہ عورت تمام احکام میں قضا کے فرائض سر انجام دے سکتی ہے۔ امام الماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیۃ میں علامہ ابن جریر طبری کی اس وسیع النظری کو تنقید کا ہدف بنایا ہے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لا اعتبار بقول یردہ الاجماع مع قول اللہ تعالیٰ "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض"

یعنی اس قول کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا جسے اجماع نے رد کر دیا ہو اور خود اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ مرد عورتوں کے قوام مقرر کیے گئے ہیں۔

غالباً وہ قوامون کا معنی حاکم یا اس قسم کی کوئی چیز لیتے ہیں۔ مگر قوام کا تعلق - قام، قوماً، قیام وغیرہ سے ہے۔ قوم کے معنی کھڑا کرنے، قائم کرنے، بیدار کرنے، درست کرنے اور قدر و قیمت کرنے کے ہیں۔ عربی کی شہرۂ آفاق لغت کی کتاب تاج العروس میں قام علیہا کے معنی مانہا وقام بشأنہا متکفلا بامرھا (اس عورت کی روزی مہیا کی اور اس کے امر کی کفالت کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا) لکھتے ہیں۔

چوتھی شرط قوتِ سامعہ اور باصرہ کی سلامتی ہے تاکہ اثباتِ حقوق کی صحت، مدعی و مدعا علیہ میں فرق اور اقرار و انکار کرنے والوں میں امتیاز ممکن ہو اور حق و باطل میں تمیز ہو سکے۔ اس لحاظ سے اندھا قاضی نہیں بن سکتا۔ مگر امام مالک اندھے کو قاضی بننے کی اجازت دیتے ہیں۔ بہرے کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ البتہ سلامتی اعضا قاضی کے لیے ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اپاہج قاضی ہو سکتا ہے۔

---

۵۴ بدائع الصنائع، ج ۷، ص ۳

پانچویں شرط احکام شرعیہ کا علم ہے۔

چھٹی شرط آزادی و حریت ہے یعنی کوئی غلام قاضی نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ غلام تو شہادت دینے کا بھی اہل نہیں ہے وہ تنفیذ احکام اور تفویض عہدۂ قضا کا اہل کیوں کر ہو سکتا ہے۔

ساتویں شرط عدالت ہے، جس کی تعریف ماوردی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

ان یکون صادق اللھجۃ، ظاھر الامانۃ عفیفاً عن المحارم، متوقیا المآثم، بعیداً عن الریب، مأموناً فی الرضاء والغضب مستعملاً للمروءۃ مشلہ فی دینہ ودنیاہ۔

یعنی عدالت سے مراد یہ ہے کہ صادق القول، امانت دار، حرام چیزوں سے دامن پاک رکھنے والا، گناہوں سے بچنے والا، شبہات سے دور رہنے والا، خوشنودی اور غصے میں قابل اطمینان اور اپنے ہم مرتبہ لوگوں کی طرح دین و دنیا کے معاملات میں مروت سے کام لینے والا ہو۔

گویا یہ تمام خوبیاں ایک قاضی میں پائی جانی چاہئیں اور ان سب کے لیے ایک لفظ عدالت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ نے قاضی کے منصب کے لیے عدالت کی شرط نہیں لگائی۔ انھوں نے عدالت کو شرط کمال سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے فاسق کو بھی قضا کی اجازت دی ہے۔ لیکن امام شافعی نے فاسق کے تقرر برائے قضا کی اجازت نہیں دی، کیوں کہ فاسق کی شہادت قبول نہیں۔[۵]

فقہائے اسلام نے قاضی کے صحیح تقرر کے طریق کی بہت کچھ تحقیق کی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں کہ قاضی کے عہدے کا تقرر دو طرح کے لفظوں سے ہوتا ہے، صریح اور کنایہ۔ صریح الفاظ چار ہیں۔ (۱) میں نے تم کو مقرر کیا (۲) والی بنایا (۳) خلیفہ بنایا (۴) نائب بنایا۔ کنایہ کے الفاظ ہمارے علما کے نزدیک سات ہیں (۱) میں نے تم پر اعتماد کیا (۲) بھروسہ کیا (۳) تمھاری طرف لوٹا دیا (۴) تمھاری طرف کر دیا (۵) تمھیں تفویض کیا (۶) تمھاری وکالت میں دیا (۷) تمھاری طرف منسوب کیا۔ تکمیل تقرر کے لیے اس کے علاوہ چار شرائط بھی لازمی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والا یہ جانتا ہو کہ جس کو وہ قاضی مقرر کر رہا ہے اس میں اس عہدے کی تمام شرائط موجود ہیں ورنہ تقرر صحیح نہ ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تقرر کرنے والے کو

---

۵ کاسانی۔ بدائع الصنائع جلد ۷، ص ۲

علم ہو کہ قاضی نے اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے یا نہیں۔ اس شرط کا تعلق انعقاد تقرر کے ساتھ نہیں، جیسا کہ پہلی شرط کا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ جس عہدے پر متعین کیا جائے، اس عہدے کا نام لے کر متعین کیا جائے۔ چوتھی شرط شہر کا تعین بھی ضروری ہے جہاں پر کہ اسے متعین کرنا ہے۔ امام ابوالحسن الماوردی نے احکام السلطانیہ میں قاضی کے فرائض پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل دس فرائض بیان کیے ہیں:

(۱) تنازعات کا فیصلہ کرنا (۲) صاحب حق کو اس کا حق دلانا (۳) جنون اور بچپن کی وجہ سے جن مستحقین کے تصرفات ممنوع ہوں، ان کے نگران مقرر کرنا (۴) اوقاف کی نگرانی (۵) وصیتوں کا نفاذ (۶) اگر بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں تو رشتہ آنے کی صورت میں ان کا نکاح کرانا۔ امام ابوحنیفہ یہ کام قاضی کے ذمے نہیں ڈالتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ بیوہ خود اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ (۷) حدود (سزاؤں) کا جاری کرنا (۸) اپنے حلقۂ عمل میں مصالح کا خیال رکھنا اور سڑکوں پہ ناجائز تجاوزات کو روکنا اور ناجائز عمارت یا مکان وغیرہ نہ بننے دینا۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قاضی یہ کام بغیر کسی مدعی کے استغاثہ کے نہیں کر سکتا۔ (۹) گواہوں اور اپنے اعتماد کے لوگوں کی چھان بین کرنا۔ نیک چلن اور اچھے منتظمین کو عہدوں پر برقرار رکھنا اور بدچلن اور نااہل کارندوں کی جگہ بہتر لوگوں کو دینا (۱۰) مقدمات کے فیصلوں میں ضعیف اور طاقت ور میں امتیاز نہ کرنا۔

اگر قاضی قضا میں غلطی کرے اور غلط فیصلہ کرے اور بعد کو اس کی حقیقت کھل جائے تو قاضی سے باز پرس نہ ہوگی، کیوں کہ اس نے حقیقت کی چھان بین میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا بلکہ وہ تو حسب امکان مصلحت کا ہی طالب تھا۔ اگر مال کے متعلق فیصلہ دیا تھا تو اگر وہ مال بدستور موجود ہو تو حقیقی مالک کو لوٹا دے، اور اگر جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا اس نے مال کو تلف کر دیا ہے تو اس سے ضمانت لے۔ اگر فیصلہ مالی نہیں ہے جیسے کہ حکم طلاق تو پھر اس حکم کو منسوخ کر دے اور اگر فیصلے کا تعلق حقوق اللہ میں سے کسی ایک حق کے متعلق ہے تو پھر بیت المال پر تعویض (بدلے) کی ذمے داری ہوگی۔ کیوں کہ قاضی کا حکم مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تھا۔ اس لیے اس تعویض کا بوجھ مسلمانوں پر بذریعہ بیت المال کے پڑے گا[۵۶]

---

[۵۶] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۷، ص ۱۶

قضا ایک امر واجب ہے اور کوئی معاشرہ اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، کیوں کہ عدلیہ کا فرض ہے کہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ حاکم کا فرض ہے کہ عادل کو منصبِ قضا پر فائز کرے اور اس عہدے کے محض طلب گار کو یہ منصب تفویض نہ کرے۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں طلبِ قضا کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں غیر مجتہد کسی صورت میں قاضی نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب اہلِ اجتہاد ہو۔ اس کی تین صورتیں ہیں، اوّل یہ کہ وہ ایک نا اہل یا ظالم کو منصبِ قضا سے ہٹانے کے لیے اس کی جگہ اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ اس صورت میں وہ مستحقِ اجر ہے۔ دوسری صورت عداوتِ ذاتی ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ ایک قابل آدمی کو ہٹا کر خود قاضی بننا چاہتا ہے تو یہ طلب ممنوع ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ خالی جگہ پڑی ہے اور بیت المال سے تنخواہ ملنے کی امید میں طلب کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر عزت و منزلت کے لیے طلب ہے تو اس کے جواز میں اتفاق ہے مگر کراہت میں اختلاف ہے۔ بعض علما کے نزدیک مکروہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مکروہ نہیں ہے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا اجعلنی علی خزائن الارض۔ اسی سلسلے میں یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظالم کی طرف سے پیش کی گئی ولایتِ قضا قبول کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر حق پر عمل ہو سکے تو جائز ہے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی خیال سے درخواست کی تھی۔ مگر جو اسے ناجائز سمجھتے ہیں اور ظالم کی ولایتِ قضا سے منع کرتے ہیں وہ یہ دو جواب دیتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حضرت یوسفؑ کا فرعون نیک تھا اور حضرت موسیٰ کا فرعون طاغی تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یوسف مال کے نگران تھے۔ حاکم یا عامل نہ تھے۔ منصبِ قضا کے حصول کے لیے مال و دولت خرچ کرنا رشوت دینے کے برابر ہے۔

منصبِ قضا کے ترک (رفض) کے حکم کا انحصار اہل کفاءۃ (یعنی اس منصب کی اہلیت رکھنے والے) کی رسد (supply) اور قوم کو ان کی ضرورت یا طلب (Demand) پر ہے۔ اگر صرف ایک ہی شخص کو اس منصب پر متعین کیا جائے اور اس کے سوا اور کوئی اس عہدے کا اہل نہ مل سکے تو اس کا قبول کرنا اس شخص پر فرض ہوگا کیوں کہ امت کو اس کی ضرورت ہے[۵۵] اور اگر متعدد اشخاص اس

---

[۵۵] کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۴

سے اہل ہوں تو کسی کو اس کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عصور اسلامیہ میں بہت سے علمائے کرام نے منصب قضا کو ترک کیا ہے اور بعض کو تو اس ترک کی وجہ سے مارا بھی گیا ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہ کو اس منصب کو ٹھکرانے پر کوڑے لگائے گئے تھے[۵۸] مگر علمائے متاخرین کا منصب قضا کو قبول کرنے سے انکار کرنا شاید اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں اپنے آپ کو آزاد محسوس نہیں کرتے تھے اور ان کو خوف تھا کہ حکومت وقت ان کے فرض منصبی میں دخل انداز ہوگی اور انھیں ایسا فیصلہ دینا ہوگا جو ان کے ضمیر کے خلاف ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمائے دین کے اس موقف نے انھیں تاریخ اسلامی میں بلند مقام عطا کیا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت بہت بڑھی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عدلیہ اسلام میں ہمیشہ حقوق انسانی کی علم بردار رہی ہے اور اس نے ایسے ذہین، عادل اور نڈر قاضی پیدا کیے ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

---

۵۸ عبارت یوں ہے: روی ان اباحنیفة رضی اللہ عنہ عرض علیہ القضا فتابی حتیٰ ضرب علی ذلک ولم یقبل وکذا لم یقبلہ کثیر من صالحی الامة۔

مجموعۂ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی

سید نصیر شاہ و محمد رفیع اللہ

مشہور معتزلی مفسر ابو مسلم کے ان تفسیری اقوال کا مجموعہ جو امام رازی نے اپنی تفسیر میں مختلف مقامات پر نقل کیے تھے۔ جہاں ابو مسلم نے دوسرے مفسرین سے اختلاف کیا ہے وہاں مختصراً دوسرے مفسرین کے اقوال بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور